تاثرات

ندوہ کا خواب اوّل اوّل کس کی چشمِ بصیرت نے دیکھا اور کیونکر یہ حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

مدرسہ فیضِ عام کانپور کے ایک سالانہ اجلاس میں مولانا محمد علی مونگیری نے تحریکِ ندوۃ العلماء کی طرح ڈالی۔ یہ ۱۸۹۲ کا قصہ ہے۔ اس تاریخ ساز اجلاس میں جن حضرات نے شرکت کی اور اس تجویز کو نہ صرف سراہا بلکہ اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داریوں کو بھی قبول فرمایا، ان میں خصوصیت سے مولانا لطف اللہ علی گڑھی، محمد اشرف تھانوی، مولانا ثناء اللہ امرت سری، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا فخر الحسن گنگوہی اور مولانا شاہ حافظ تجمل حسین دیسنوی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس نمائندہ اجتماع میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی جائے جو علما اور اہلِ دانش حضرات کے قدیم و جدید روایات و اقدار کا بہترین امتزاج ہو۔ اس تجویز نے ۱۸۹۸ میں عملی شکل اختیار کی اور اسی سال ستمبر کی کسی تاریخ میں دار العلوم ندوۃ العلما کے باقاعدہ افتتاح کی خبر نے ملک کے تمام علمی و دینی حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ مختلف انجمنوں اور جماعتوں نے اپنے اپنے دائروں میں اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔

دار العلوم میں تعلیم و تدریس کی مسند کو پہلے پہل زینت بخشنے والے مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید شبیر علی اور مفتی عبد اللہ ٹونکی ایسے جلیل القدر اور جید علما تھے اور ان کے فیضِ صحبت سے استفادہ کر کے جو حضرات علم و ادب کے آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ان کی خدمات سے کون آشنا نہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، حاجی معین الدین ندوی اور مولانا ضیاء الحسن ندوی اس سلسلۃ الذہب کی وہ تاباں کڑیاں ہیں، جن کی ضیا گستری سے آج بھی انجمنِ ذوق و عرفان کا ہر گوشہ منور اور مستنیر ہے۔

علم و فضل کا یہ گہوارہ اپنی عمر کے ۸۵ سال پورے کر چکا ہے اور اس مناسبت سے یارانِ نجد مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی اور محمد عمران خاں ندوی کی ہمت بلند نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ کو ندوہ کا ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی منا

ڈالا جس میں عالم اسلامی کے چیدہ اور منتخب اہلِ علم نے شرکت کی اور اپنے علمی مقالوں، پُرمغز تقریروں اور مفید عملی تجویزوں سے جشن میں شریک تمام حضرات کو نوازا۔

اس اجلاس کے انعقاد کا اہم مقصد یہ تھا کہ قریب قریب ایک صدی پر پھیلے ہوئے اس طویل عرصے میں فرزندانِ ندوہ نے اگرچہ علم و ادب کی مشعلوں کو نئی ضیا بخشی ہے اور ذوق و عرفان کے دبستانوں کو سجانے میں خاصے سلیقے اور ہنر کا ثبوت دیا گیا ہے تاہم ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر زمانہ کی تیز رفتاریوں نے ہمارے لیے جو غور و فکر کے خطرناک موڑ پیدا کر دیے ہیں، ان کی روشنی میں اپنے گزشتہ کام کا ہم حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور آئندہ کے لیے ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جس سے روشنی کا یہ سرچشمہ استفادہ اور استفاضہ کے دائروں کو ذکر و دانش کے وسیع تر کناروں تک پہنچا سکے۔

ان حضرات نے اس مسئلہ کے بارہ میں کن کن زاویوں سے غور کیا، کیا سوچا، کن تجاویز پر بحث ہوئی اور آخر کار آئندہ کے لیے کیا طریق کار متعین ہوا۔ افسوس ہے کہ اس کے بارہ میں ہنوز ہمیں تفصیلات موصول نہیں ہو پائیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ تبصرہ و تنقید کی کھکھیڑ میں پڑے بغیر اربابِ اہتمام کی خدمت میں تہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرنے پر اکتفا کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ہر حال میں معین و مددگار ہو۔

موجودہ دور میں تعلیم و تدریس کا انداز کیا ہو اور خصوصیت سے دینی مدارس میں کس نوع کی اصلاحات کو بروئے کار لایا جائے، یہ سوال اپنی جگہ اس درجہ اہم ہے کہ پورے عالم اسلامی میں اس پر غور ہونا چاہیے۔ کیونکہ آج کی ضروریات اور تقاضے ماضی قریب کی ضروریات اور تقاضوں سے قطعی مختلف اور جداگانہ نوعیت کے حامل ہیں۔ جس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد پڑی، دیوبند کی تاسیس ہوئی، یا دارالعلوم ندوہ کا قیام عمل میں آیا، اس وقت حالات قدرے پُرسکون تھے۔ یہ وہ دور تھا جب الحاد و انکار کی وہ آندھیاں نہیں چلی تھیں جن سے اس نسل کے لوگ دوچار ہیں۔ اس وقت دینِ حق کی تعبیر و تشریح اور نشر و ابلاغ کا فریضہ انجام دینا نسبتاً سہل تھا۔ اس دور کا ذہن تاویل و استدلال میں لیپا پوتی اور اعتذار کے ایک خاص انداز سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ لیکن آج یہ اسلوب استدلال قطعی کارگر نہیں اس لیے کہ آج کفر نے تشکیک و ارتیاب کے ابتدائی دور سے نکل کر مثبت نظریات کی شکل اختیار کر لی ہے، جن کا جواب اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمارے علما اور دانش ور اپنے فکری دور کا آغاز اس

نقطۂ عروج سے کریں۔ جہاں آج مغرب کے اہلِ علم فائز ہیں اور پھر مسلسل بیس تیس برس کی محنت شاقہ کے بعد جب علومِ جدیدہ میں مجتہدانہ مقام پیدا کریں تو دیانتداری سے سوچیں کہ ان میں کہاں کہاں بگاڑ اور خلل رونما ہے۔ کہاں کہاں صحت و ثواب کے پہلو نمایاں ہیں اور فکر و نظر کے اس طویل سفر میں وہ کون کون سے موڑ اور مقامات آتے ہیں جن سے اسلام کی تائید و اثبات کے شواہد مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اصل دشواری یہ حائل ہے کہ بحث و استدلال تعلیم و تعلم اور رجحانات و خیالات کے اعتبار سے ہم آج ہر اس مقام سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ پائے جہاں گیارھویں اور بارھویں صدی میں یورپ کھڑا تھا :

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام ربِ فاطر کا دین ہے اور اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو عقل و دانش کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ یا جن پر ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی معذرت یا ندامت کا اظہار کرنا پڑے۔ ہمیں اس کی صداقت پر پورا پورا یقین ہے اور اس پر بھی کامل یقین ہے کہ مستقبل میں، یہی وہ دین ہے جس کو پڑھا لکھا اور مہذب انسان اپنا کر قلب و ذہن کے اطمینان کا سامان فراہم کر سکے گا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا، جب ہم اپنی علمی کوششوں سے ان فاصلوں کو عبور کر لیں، جو بارھویں صدی اور بیسویں صدی میں واقع ہیں۔ اور ہم یہ طے کریں کہ ہمیں نہ صرف جدید دور کے علوم و فنون کو اپنانا ہے اور موجودہ دور کی تہذیبی و اجتماعی روح کو سمجھنا ہے، بلکہ ان میں بصیرت و ادراک کی بلندیوں تک رسائی حاصل کرنا ہے، جہاں آج کے دانشوروں نے اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔

(محمد حنیف ندوی)